© rasailojaraid.com

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم/انتخاب وضمیمہ: شکیل عثمانی　　　قسط اوّل

''ضربِ کلیم'' اور احمدیت

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کا یہ مضمون ہمارے کرم فرما جناب شکیل عثمانی نے چند ماہ قبل ''نقیبِ ختمِ نبوّت'' میں اشاعت کے لیے ارسال فرمایا۔ جو علامہ اقبال مرحوم کے شعری مجموعے ''ضربِ کلیم'' پر قادیانی تبصرے کا جواب ہے۔ قادیانی تبصرہ ہفت روزہ سن رائز میں شائع ہوا لیکن اس میں تاریخ اشاعت ۱۰ اکتوبر کے ساتھ سن درج نہیں۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا یہ جوابی مضمون علامہ اقبال کی زندگی میں شائع ہوا۔ جسے بعد میں نذیر نیازی مرحوم نے اپنی کتاب ''ادبیّاتِ ملیّہ'' میں شائع کیا۔ اصل حوالہ اور سن اشاعت کی تلاش جاری ہے۔ اپریل کے شمارے میں علامہ اقبال کے یومِ وصال کی مناسبت سے شائع کیا جا رہا ہے۔ آئندہ شمارے میں جناب شکیل عثمانی کا تجزیہ اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کے احوال شامل اشاعت ہوں گے۔ (مدیر)

علامہ اقبال کے شعری مجموعے ضربِ کلیم کی اشاعت پر اکثر اربابِ بینش کو یہ خیال ہوا تھا کہ احمدی حضرات اس کے بعض اشعار کو اپنی تعریض پر محمول کریں گے۔ چنانچہ ۱۰ اکتوبر کے (ہفت روزہ) سن رائز میں جو ''ریویو'' اس کتاب پر شائع ہوا ہے اس نے اس خیال کی تصدیق کر دی۔ احمدی حضرات نے علامہ مدظلہٗ کے بعض اشعار کو ''سلسلۂ عالیہ'' کی طرف منسوب کر کے قادیانی خانہ ساز نبوت کا راز اس خوبصورتی کے ساتھ فاش کیا ہے اور اپنی تضحیک کا ایسا دلکش سامان بہم پہنچایا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ غالباً اسی لیے کسی دانا نے یہ کہا ہے کہ خدا انسان کو نادان دستوں سے محفوظ رکھے۔

مدیر ''سن رائز'' کو کیا خبر کہ اس کتاب میں افراد واشخاص سے بحث نہیں کی گئی بلکہ فلسفیانہ طریق پر عہدِ حاضر کا تجزیہ کیا گیا ہے اور اس کی غلط روش، غلط تعلیمات، غلط خیالات اور غلط منطق کی نہایت واضح الفاظ میں مذمت کی گئی ہے۔ افرنگ اور دانشِ افرنگ کے ساتھ عرب وعجم اور ایران و ہندوستان پر بھی تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ کے مختلف شعبوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ الغرض ضربِ کلیم مغرب اور مشرق دونوں پر بے لاگ تبصرہ ہے۔ جس کی نظیر اردو تو کیا اس وقت تمام ایشیائی لٹریچر میں بھی ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کے انحطاط خیز رجحانات اور ملوکیت پسند تاویلات کی تشریح کے آئینہ میں جو علامہ کے قلمِ معجز رقم نے کی ہے، قادیان اور اربابِ قادیان کو اپنی صورت نظر آ گئی وگرنہ، ہم مدیر ''سن رائز'' کو یقین دلاتے ہیں کہ قادیانیت اس درجہ اہم نہیں کہ علامہ اس کے تذکرہ سے ضربِ کلیم کے صفحات سیاہ فرماتے۔

اس ریویو کو پڑھنے کے بعد جو چیز نمایاں طور سے نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ لکھتے وقت مدیر ''سن رائز'' کا توازنِ دماغی قائم نہ رہ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ریویو ضربِ کلیم پر تنقید کے بجائے احمدیت کی تائید کی شکل میں بدل گیا۔

مدیر مذکور نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال جہاد کے قدیم، پارینہ اور خونی تصوّر کے قائل ہیں، برطانوی ملوکیت کے دشمن ہیں اور بے قوت نبوت کو برگِ حشیش سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن جب ہم احمدیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریک جہاد کو منسوخ اور ناجائز قرار دیتی ہے۔ برطانوی ملوکیت کی ثنا خواں ہے بلکہ اسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آیۂ رحمت سمجھتی ہے اور بے قوت نبوت پر ایمان رکھتی ہے۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مدیر مذکور ڈاکٹر صاحب سے اس قدر خفا کیوں ہیں؟ اور ان کی تنقید کو Oblique Remarks یعنی در پردہ تعریض کیوں سمجھتے ہیں۔ اس درجہ تفاوت ہے کہ بُعد المشرقین نظر آتا ہے تو مدیر کو شکایت کرنے کا کیا حق ہے؟ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے مسلک کی اشاعت میں آزاد اور خود مختار ہیں۔ اگر اس کی بنا پر تمہارے مسلک پر زد پڑتی ہے تو کوئی کیا کرے؟ کیا علامہ موصوف محض اس خیال سے اعلائے کلمۃ الحق سے باز رہیں کہ ان کے کلام معجز نظام کی ضرب سے احمدیت کے آبگینے چکنا چور ہو جائیں گے؟

اگر ہم چوری کی مذمت کریں اور کوئی چور اس مذمت کو سن کر یہ کہنے لگے کہ یہ مجھ پر در پردہ تعریض کی گئی ہے تو یہ اس کی اپنی سمجھ کا قصور ہے۔ اس معاملہ میں سوائے اس کے کہ اس شخص کے ساتھ ہمدردی کی جائے اور چارہ کار ہی کیا ہے؟ قرآن مجید میں اس فعل کی بار بار مذمت کی گئی ہے۔ سوءِ اتفاق سے ابولہب نے خانہ کعبہ سے سونے کا ایک ہرن چرایا تھا لہٰذا جب کبھی وہ ان آیات کو جن میں چوری کی مذمت کی گئی ہے، سنتا تھا تو یہی کہتا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے در پردہ مجھ پر چوٹ کی ہے۔ بعینہٖ یہی حال ہمارے احمدی دوستوں کا ہے حالانکہ بات بالکل صاف ہے۔ تم ان تینوں باتوں کے قائل ہو۔ ڈاکٹر صاحب ان تینوں کے سخت مخالف ہیں اور ان کو علیٰ وجہ البصیرت اسلام کی روح کے منافی خیال فرماتے ہیں۔ پھر تم ان کی تنقید کو پڑھ کر نعل در آتش کیوں ہوتے ہو اور ان سے وجہِ شکایت کس لیے پیدا کرتے ہو؟ تمہارا مذہب اور، ان کا مسلک اور۔ وہ رہ نوردِ کعبہ، تم عازم ترکستان! جب فی مابین، کوئی وجہِ اتحادِ خیال ہی نہیں تو اس واویلا کی کیا ضرورت ہے۔

آیئے! اب نہایت سکونِ قلب کے ساتھ ان حقائق سہ گانہ کا مذہبی اور عقلی زاویہ نگاہ سے تجزیہ کر کے دیکھیں تا کہ ڈاکٹر صاحب کا مسلکِ زریں ہر شخص پر روز روشن کی طرح ہویدا ہو جائے۔

ا۔ اسلامی جہاد کی تعریف:

اپنے مذہب یا اس شے کی حفاظت اور بقا کی خاطر، جسے انسان مقدس اور محترم سمجھتا ہو، اپنی زندگی تک قربان کر دینا، یہ اسلامی جہاد کی تعریف ہے۔ عقل، تاریخ اور مشاہدہ تینوں اس کی تائید کرتے ہیں۔

(الف)　اگر کوئی شخص اپنے مذہب، ثقافت (کلچر) یا مقدس روایات یا وطنِ عزیز کی حفاظت کے لیے بھی تلوار نہیں اٹھا سکتا تو پھر خدا جانے اس کی تلوار کس دن کام آئے گی؟ تلوار تو بنائی ہی اس لیے گئی تھی کہ اپنی جان و مال اور دین و ایمان کی حفاظت و حمایت میں بلند کی جائے اور یہی تعلیم اسلام کی ہے کہ اس کو اس وقت نیام سے باہر نکالا جائے جب دشمن تم پر یا تمہارے مذہب پر یا تمہارے ملک پر حملہ آور ہو۔

(ب)　آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل بھی اسی حقیقت پر شاہد ہے۔ آپ نے اسلام کی اشاعت کے لیے یا لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے کے لیے یا دوسروں کو ان کے وطن سے محروم کرنے کے لیے کبھی ہرگز تلوار نہیں اٹھائی۔ آپ نے بلاشبہ جنگوں میں حصہ لیا لیکن وہ سب رفعِ فتنہ کے لیے تھیں۔

(ج)　اپنے مذہب اور اپنے مقاماتِ مقدسہ مثلاً بہشتی مقبرہ اور منارۃ المسیح کی حفاظت کے لیے اپنا خون بہانے اور اپنی جانیں قربان کرنے کا اعلان خود قادیان کی سر زمین سے بھی کئی دفعہ ہو چکا ہے۔

الغرض جہاد کرنا انسانی فطرت کا تقاضا ہے، ہر شخص کو دنیا میں جینے اور آزادی کے ساتھ اپنی مذہبی روایات پر عمل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے کا حق حاصل ہے اور اگر کوئی طاقت اس معاملہ میں اس کی مزاحم ہو تو اس کا مقابلہ کرنا، **حتیٰ یکون الدین کلہ للہ** سراسر قرینِ عقل وصواب ہے۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ میں کس مقصد کی تکمیل کر رہا ہوں، اس وقت تک اپنی تلوار نیام سے باہر نہیں نکال سکتا۔ انسان اس وقت جنگ کرتا ہے جب اپنے آپ کو برسرِ حق یقین کرتا ہے۔ حکومتیں انسانی فطرت کے اس پہلو سے آگاہ ہیں اس لیے وہ دنیاوی جنگوں کو بھی جن کا مقصد قتل وغارت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا، مقدس بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ صلیبی جنگوں کا مقصد دراصل یہ تھا کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکا جائے لیکن حکومتوں نے پادریوں کی وساطت سے ان جنگوں کو ”مقدس“ قرار دلوایا تاکہ لوگ آمادۂ پیکار ہو سکیں۔ حالانکہ صلیبی اقوام نے ارضِ شام میں جس بربریت اور سفاکی کا مظاہرہ کیا اسے تقدس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ خود ہمارے زمانہ میں جو محاربہ عظیم یورپ میں برپا ہوا، برطانوی مدبرین نے اسے بھی پادریوں کے ”مقدس“ ہاتھوں سے تقدس وبپتسمہ دلوایا۔ چنانچہ کنٹر بری کے اسقفِ اعظم نے اعلانا شائع کیے کہ شریکِ جنگ ہونے سے برطانیہ کو اپنا کوئی نفع مدنظر نہیں ہے۔ اس نے محض حق وصداقت کی حمایت میں تلوار اٹھائی ہے اور کمزور کی حمایت کی غرض سے شریکِ جنگ ہوا ہے۔ حال ہی میں ایک انگریز مصنف نے جس کا نام Irene Cooper Wills ہے، جنگِ عظیم کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے England's Holy War انگلستان کی جنگِ مقدس۔ الغرض اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے تلوار چلانا، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ممنوع تھا (لا اکراہ فی الدین) اور آج بھی ممنوع ہے اور اسلام کی حمایت اور حفاظت کے لیے تلوار اٹھانا ابتدائے اسلام میں بھی جائز تھا اور آج بھی جائز ہے اور قیامت تک جائز رہے گا۔ مرزا صاحب سے جو غلطی دانستہ یا نادانستہ طور پر سرزد ہوئی، وہ یہ تھی کہ انہوں نے اسلامی جہاد کے غلط معنی دنیا کے سامنے پیش کیے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اے دوستو جہاد کا اب چھوڑ دو خیال
دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال

ان دونوں مصرعوں میں جو لفظ ”اب“ آیا ہے اگرچہ ادبی زاویۂ نگاہ سے اس کی تکرار بہت مذموم ہے لیکن مرزا صاحب کی، اسلام سے ناواقفیت کا ثبوت دینے کے لیے بہت کافی ہے یعنی ان کا مطلب یہ ہے کہ دین کے لیے جنگ وقتال پہلے جائز تھا، اب جائز نہیں ہے۔ کس قدر عظیم الشان مغالطہ ہے جو انھوں نے دنیا کو دیا۔

کاش انھیں تاریخ وفلسفۂ اسلام سے واقفیت ہوتی، بندۂ خدا! دین کی اشاعت کے لیے جہاد کرنا پہلے کب جائز تھا؟ جو تم آج ناجائز قرار دے رہے ہو؟ اسلام پہلے کب بزورِ شمشیر پھیلایا گیا جو آج تم ناصح مشفق بن کر اس کی ممانعت کر رہے ہو؟

اگر جوع الارض کو تسکین دینے کے لیے یا ملوکیت اور شہنشاہیت قائم کرنے کے لیے یا بے گناہ اقوام کو غلام بنانے کے لیے جہاد کیا جائے تو وہ جہاد ہی کب ہے؟ وہ تو غارت گری ہے۔ خود علامہ فرماتے ہیں:

جنگ شاہانِ جہاں غارت گری است
جنگِ مومن سنتِ پیغمبری است (۱)

تعجب ہوتا ہے تعلیم یافتہ احمدی حضرات پر کہ یہ لوگ کیونکر اس سفسطہ کا شکار ہو سکتے ہیں؟ کیا احمدیوں میں کوئی ایسا روشن خیال انسان نہیں جو اسلامی فلسفہ وتاریخ کا مطالعہ کر کے اس مغالطہ کی دلدل سے باہر نکل سکے؟ قرآن مجید کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطالعہ کرنے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوسکتی ہے کہ اسلام میں جہاد کا معنی اور مفہوم کیا ہے؟ جنگ اور قتال اگر اس کا محرک ہوسِ ملک گیری اور استعماری حکمتِ عملی ہو تو یہ بات اسلام میں کبھی بھی جائز نہ تھی۔ پھر مرزا صاحب اپنے اس ''الہامی شعر'' میں کس چیز کو حرام قرار دے رہے ہیں؟ اسی بات کو نا، جو پہلے ہی سے حرام ہے، تو حرام کو حرام قرار دینا یہ کون سی دانش مندی ہے؟ اور اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ خطرہ کے وقت بھی مسلمانوں کا اپنے مذہب کی حمایت میں تلوار اٹھانا حرام ہے تو وہ مذہبِ اسلام سے اپنی ناواقفیت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں سے قادیانی حضرات جو صورت پسند کریں اختیار فرمالیں، مرزا صاحب کی علمی اور مذہبی پوزیشن بہرحال متزلزل ہوجائے گی۔ اگر پہلی صورت صحیح ہے تو مرزا صاحب مغالطہ کے مرتکب ثابت ہوتے اور دوسری صورت کو تسلیم کیا جائے تو اسلام کے اصولوں سے کورے نظر آتے ہیں۔

اسی لیے حکیم الاُمّت علامہ اقبال مدظلہٗ نے مسلمانوں کو مرزا صاحب اور مرزائیت دونوں کی غلط تعلیمات سے محفوظ کر لینے کے لیے اسرارِ خودی میں اس حقیقت کو آشکار فرمادیا ہے کہ اسلام میں جہاد کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان کی زندگی کا مقصدِ وحید اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور اگر کوئی طاقت مسلمان کو اس کے اس مذہبی فریضہ کی تکمیل سے باز رکھنا چاہے یا اس میں مزاحمت کرے تو وہ حق وصداقت کی حمایت میں تلوار اٹھاسکتا ہے۔ لیکن وہ جہاد جس کا مقصد جوع الارض ہو، تسخیرِ ممالک ہو یا قتل وغارت گری ہو، اسلام میں بالکل حرام ہے۔ چنانچہ علامہ فرماتے ہیں:

ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید
تیغ اُو در سینۂ او آرمید (۲)

اب جو شخص بھی مرزا صاحب کے مذکورہ بالا شعر کو پڑھے گا وہ لامحالہ یہی سمجھے گا کہ دین کی اشاعت کے لیے پہلے اسلام میں جنگ وقتال جائز تھا یعنی نعوذ باللہ قرونِ اولیٰ میں اسلام کی اشاعت اس کے پاکیزہ اصولوں کی وجہ سے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے ہوئی اور تیرہ سو سال کے بعد جا کر مرزا صاحب نے اس بات کو حرام قرار دیا ہے۔

معلوم نہیں مرزا صاحب نے جہاد کے متعلق یہ غلط خیال کیوں پھیلایا۔ شاید حکومت کی نظروں میں عزت حاصل کرنے کے لیے ورنہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دین کی اشاعت کے لیے تلوار چلانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی جائز نہ تھا اور نہ قرآن مجید کی اس صریح آیت کی موجودگی میں (لا اکراہ فی الدین) کسی کو بزورِ شمشیر مسلمان کرنا جائز ہوسکتا ہے اور اسلام تو سرتاپا معقولیت پسند مذہب ہے۔ وہ کب اس بات کو روا رکھ سکتا ہے کہ لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنایا جائے۔

اگر دین کے لیے جنگ وقتال مرزا صاحب سے پہلے حلال ہوتا تو ڈاکٹر آرنلڈ جو ایک سچا مسیحی تھا اور یقیناً مسلم نہ تھا کس طرح اپنی مشہور کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' مرتب کرسکتا تھا؟ اس کتاب میں اس منصف مزاج انگریز نے اسلامی تاریخ کی بناء پر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچادی ہے کہ اسلام اپنی ابتدا سے آج تک تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔ (۳)

۲۔　قادیان کے مسلکِ جاسوسی پر عمل کرنے کے لیے دوسرا اعتراض مدیر ''سن رائز'' نے یہ کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اسلامی ممالک پر برطانوی اقتدار کو ناپسند کرتے ہیں اور دولِ مغرب کی استعماری حکمتِ عملی کے خلاف ہیں۔

جہاں تک میں نے غور کیا اس باب میں بھی مدیر مذکور کی ناراضگی کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تمہارا مسلک انگریزوں کی غلامی ہے یہ تمہیں مبارک رہے۔ ڈاکٹر صاحب کا مسلک درسِ حریت وآزادی ہے وہ انہیں مبارک رہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آخر تم کو ان پر اعتراض کرنے اور ان کی تعلیم پر ناک بھوں چڑھانے کا کیا حق حاصل ہے؟ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنے مسلک کی یا اس بات کی جسے وہ صحیح سمجھتا ہے تبلیغ کرے اور بلا خوف و خطر تبلیغ کرے۔ دیکھنا اگر ہے تو یہ، اور غور کے قابل اگر کوئی بات ہے تو یہ کہ کس کی تعلیم منشائے اسلام کے مطابق ہے؟

قادیانیوں کے مذہب میں مسلمانوں کو غلامی کا سبق پڑھانا جائز بلکہ فرضِ عین ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب خود لکھتے ہیں کہ ہمارے مذہب کے دو خاص جزو ہیں: ایک خدا کی اطاعت، دوسرا گورنمنٹ برطانیہ کی اطاعت۔ اور ان کی تمام عمر مسلمانوں کو درسِ غلامی دینے اور ان کے جذباتِ حریت کو فنا کرنے میں گزری اور کیوں نہ گزرتی؟ وہ اپنے قائم کردہ سلسلہ کو جسے وہ حقیقی اسلام کہتے تھے، سرکارِ انگلشیہ کا ''خود کاشتہ پودا'' قرار دیتے ہیں اور اس بات کو بڑے فخر و مباہات سے بیان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو اسلام برطانیہ کے زیرِ حمایت سرسبز ہو وہ یقیناً اُس اسلام سے کوئی نسبت نہیں رکھتا جس کی صداقت کا آفتاب فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا تھا۔ وہ اسلام تو دنیا میں حریت اور آزادی کا سب سے بڑا علم بردار ہے۔ اس میں دوئی کی مطلق گنجائش نہیں، وہ تو صرف ایک ذاتِ مطلق کی اطاعت کا حکم دیتا ہے اور وہ ذات اللہ ہے چنانچہ مسلمان صرف اللہ کا مطیع ہو سکتا ہے، غیر اللہ کے سامنے اس کی گردن قیامت تک نہیں جھک سکتی۔ شریعت کا مسئلہ ہے کہ دنیاوی حکومت کا کوئی حکم، خدا کے حکم کے خلاف ہو تو مسلمان کا فرضِ اوّلین یہ ہے کہ غیر اللہ کے حکم ٹھکرا دے۔ چنانچہ اسوۂ حسینی اس پر شاہد عادل ہے:

تا قیامت قطعِ استبداد کرد
موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد(۴)

تاریخ شاہد ہے کہ انبیاء اپنی قوم کو درسِ حریت دینے کے لیے مبعوث ہوا کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو مصریوں کی غلامی سے نجات دلائی، حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی قوم کو حکومت اور طاقت عطا کی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی یہود کو رومیوں کی غلامی سے نجات دلانے کی کوشش کی، حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی قوم کو حکمت اور طاقت عطا کی لیکن چودھویں صدی ہجری میں جو ''نبی'' پیدا ہوا اس نے اپنی تمام عمر قوم کو غلامی کا درس دیا اور

گفت دیں را رونق از محکومی است
زندگانی از خودی محرومی است
دولتِ اغیار را رحمت شمرد
رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مرد(۵)

اگر مرزا صاحب کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کا درد ہوتا تو وہ کبھی اپنی قوم کو اغیار کی غلامی کا درس نہ دیتے لیکن وہ تو تمام عمر منارۃ المسیح، بہشتی مقبرہ اور توسیعِ مکان کی تکمیل کی فکر میں سرگرداں رہے۔ قوم کی فکر تھی ہی کب اور ہوتی بھی تو کیونکر؟

اس کے برخلاف، علامہ کے دل میں اپنی قوم کا درد ہے اور یہی درد تو انھیں مسلمانوں سے اس طرح خطاب کرنے پر مجبور کرتا ہے:

اے مسلماں! اندریں دیرِ کہن
تا کجا باشی اسیرِ اہرمن(۶)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیستن تا کے بہ بحر اندر چو خس
سخت شو چوں کوہ از ضبطِ نفس(۷)

پھر کہتے ہیں:

دانی از افرنگ و از کارِ فرنگ
تا کجا در قیدِ زنارِ فرنگ؟
زخم ازو نشتر ازو سوزن ازو
ما و جوئے خون و امید رفو؟(۸)

یہی درد تو انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے افراد کو بیداری، سخت کوشی اور جدو جہد کا پیغام دیتے ہیں:

شیخِ ملت با حدیثِ دل نشیں
بر مرادِ او کند تجدیدِ دیں(۹)

۳۔ تیسری بات جس پر مدیر مذکور ڈاکٹر صاحب سے خفا ہیں یہ ہے کہ وہ بے لوث قوت وشوکت نبوت کو برگِ حشیش سے تعبیر کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تم خود تسلیم کرتے ہو کہ مرزا صاحب قادیانی کی نبوّت بے قوت تھی تو پھر ڈاکٹر صاحب نے اسے برگِ حشیش سے تعبیر کیا تو کیا برا کیا، کیا دو اور دو کو چار کہنا جرم ہے! بلاشبہ

وہ نبوّت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوّت میں نہیں قوت وشوکت کا پیام (۱۰)

ڈاکٹر صاحب نے اس شعر میں مرزا صاحب کا نام نہیں لیا۔ صرف ایک حقیقت بیان کی ہے لیکن تم نے اس شعر کو ان کی طرف منسوب کر کے خود پردۂ نبوّت کو چاک چاک کر دیا۔

تم بے قوت نبوت کو آیۂ رحمت سمجھتے ہو۔ ڈاکٹر صاحب اسے برگ حشیش تصور فرماتے ہیں پھر جب فی مابین اتحادِ خیال ہی نہیں تو ڈاکٹر صاحب سے شکوہ کس بات کا ہے؟

چونکہ ڈاکٹر صاحب ایسی نبوّت کو برگِ حشیش سمجھتے ہیں اس لیے ان کا فرض تھا کہ مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیں کہ ایسی نبوّت جو مسلمانوں کو غلامی کا سبق پڑھائے، ان کے حق میں برگِ حشیش سے کم نہیں۔ علامہ نے مسلمانوں کو اس فتنہ سے آگاہ کر کے اپنا وہ فرض ادا کیا ہے جو حکیم الامت، مصلحِ قوم اور دانائے راز ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتا تھا۔

خدارا ہمیں یہ تو بتایا جائے کہ مرزا صاحب کی اس نبوّت اور ان کے لاتعداد الہامات سے مسلمانوں کو من حیث القوم کیا فائدہ پہنچا؟ نبوّت بلاشبہ رحمتِ الٰہی ہے لیکن اس نبوّت کو کس چیز سے تعبیر کیا جائے جو قوم کو غلامی کی زنجیروں کو اور زیادہ مضبوط کرے۔

اس وقت ہمارے سامنے یہ سوال نہیں کہ مرزا صاحب نے جو الہامات شائع کیے، وہ صحیح تھے یا غلط، سچے تھے یا جھوٹے۔ سوال تو یہ ہے کہ خدائے قدوس نے جو الہامات ان پر ''نازل'' فرمائے ہمارے لیے ان کی قیمت کیا ہے؟ کیا ان کی مدد سے یا ان پر عمل کرنے سے مسلمانوں کی موجودہ سیاسی، اقتصادی اور تمدنی مشکلات کا خاتمہ ہو سکتا ہے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آج مسلمان جن روح فرسا مصائب سے دوچار ہیں ان میں دو سب سے اہم ہیں اوّلاً استعمار پرستانِ مغرب کی دسیسہ کاریاں اور دست درازیاں، ثانیاً افلاس اور اقتصادی بدحالی۔ کیا مرزا صاحب کے الہامات میں مسلمانوں کی ان دو مصیبتوں کا کوئی علاج مل سکتا ہے؟ ایک دنیا اس حقیقت کا اعتراف کر رہی ہے کہ مسلمان روبزوال ہیں اور ان کے زوال کا اصلی سبب بے زری نہیں، بلکہ رگوں میں خون کا سرد ہو جانا، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سرد شدہ خون کو از سر نو گرمایا جائے۔ کیا مرزا صاحب کے الہامات مثلاً (۱) **ربنا العاج** (۲) بست روپیہ آنے والے ہیں (۳) پیٹ پھٹ گیا (۴) **شاتان تذبحان** وغیر ذالک کے ورد زبان کرنے یا ان پر عمل کرنے سے مسلمانوں میں شانِ کراری پیدا ہو سکتی ہے؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا ان کے تمام الہامات، ارشادات، ملفوظات اور تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ غلامی پر قناعت کرو اور دن رات انگریزی حکومت کے گن گاتے رہو۔ محکوموں کے درد کا مداوا یہ نہیں کہ انہیں غلامی کا سبق پڑھایا جائے۔ آج ہمیں مفلوج اور مجہول بنانے والے الہام کی ضرورت نہیں بلکہ ایسے الہام کی جو مردہ رگوں میں حیات پید کر سکے:

دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار (۱۱)

جو نبوت قوم کے افراد کو آغوشِ غلامی میں سُلانے کی کوشش کرے وہ برگِ حشیش نہیں تو اور کیا ہے؟

الہامات شائع کرنے کے علاوہ دوسرا کارنامہ مرزا صاحب کا پیشگوئیاں شائع کرنا اور ان کو اپنی صداقت کا نشان ٹھہرانا ہے۔ کما قال

ہاں! نہ کر جلدی سے انکار اے سفیہ نا شناس
اس پہ ہے میری سچائی کا سبھی دار و مدار (مرزا قادیانی)

لیکن وہی سوال یہاں بھی درپیش ہے کہ ان متعدد پیشگوئیوں کے شائع کرنے سے جن میں اکثر و بیشتر پوری نہیں ہوئیں، مسلمانوں کو کیا دینی یا دنیاوی فائدہ پہنچا؟ ہاں مرزا صاحب کی جودتِ طبع کی داد ضرور دینی چاہیے کہ جب کسی پیشگوئی کے پورا نہ ہونے کے بعد مریدانِ باصفا، اس کی وجہ ان سے دریافت فرماتے تھے تو وہ نہایت تسلی بخش جواب دے دیا کرتے تھے۔ مثلاً آتھم والی پیشگوئی اور محمدی بیگم والی پیشگوئیاں پوری نہ ہوئیں تو انہوں نے متشککین کی یہ کہہ کر تسلی کر دی کہ میری پیش گوئیوں میں عموماً ایک پہلو مخفی ہوتا ہے۔ جس شخص کے متعلق کی جاتی ہے اگر وہ دل میں ڈر جائے تو پیشگوئی التوا کے دفتر میں منتقل ہو جاتی ہے۔

اس جواب کو منطقی پیرایہ میں یوں بیان کر سکتے ہیں:

سوال:　آتھم کو سزا کیوں نہیں ملی؟
جواب:　وہ دل میں ڈر گیا تھا۔
سوال:　اس کے دل میں ڈرنے کا کیا ثبوت ہے؟
جواب:　کیونکہ اسے سزا نہیں ملی۔

یہ ہے قادیانی منطق! جس پر سوفسطائیوں کی ارواح بھی وجد کر رہی ہوں گی لیکن تعجب تو یہ ہے کہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ احمدی بھی اس منطقی مغالطہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مرزا صاحب نے بہشتی مقبرہ کی تعمیر کا اعلان شائع کیا تو لامحالہ یہ اعتراض وارد ہوا کہ جناب! پھر تو ایمان اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اعمالِ صالحہ کی ضرورت ہی نہ رہی۔ جس کسی نے بہشتی مقبرہ میں مدفون ہونے کا انتظام کرلیا اسے نجات کا سرٹیفکیٹ بلکہ یوں کہیے کہ بہشت کا پاسپورٹ مل گیا، تو آپ کے تعمیر کردہ بہشتی مقبرہ میں اور پاپایانِ روم کے ''تذکرۃ الغفران'' میں کیا فرق باقی رہا؟ سوال معقول تھا لیکن قربان جایئے مرزا صاحب کے ذہنِ رسا کے، جواب بھی تر شا تر شایا رکھا تھا۔ فرماتے ہیں:

''میں یہ تو نہیں کہتا کہ جو شخص اس مقبرہ میں مدفون ہوگا وہ بہشتی ہوجائے گا لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ بہشتی لوگ ہی اس مقبرہ میں مدفون ہوں گے۔''

سارے مریدانِ باصفا کی اس معقول جواب سے تسلی ہوگئی اور آج ''شیخ کلیسا'' کی یہ زندہ یادگار، زبانِ حال سے جملہ احمدیانِ کرام کو مژدۂ بہشت سنا رہی ہے۔ چنانچہ جائدادیں وقف ہو رہی ہیں، کتبے لگائے جا رہے ہیں اور ان کو دیکھ دیکھ کر ایمان تازہ ہو رہا ہے۔ سچ کہا ہے کسی عقل مند نے کہ ''یہ دنیا کبھی سادہ لوحوں سے خالی ہوئی ہے، نہ آئندہ کی اُمید ہے۔''(۱۱)

سچ پوچھا جائے تو ہمیں مرزا صاحب سے دلی ہمدردی ہے۔ نہ ان کو اسلامی تاریخ سے واسطہ تھا نہ مسیحیت کی تاریخ سے کوئی علاقہ۔ ان کی ساری عمر ''مثیلِ مسیح'' کا دعویٰ کرنے میں گزر گئی۔ لیکن انہیں آخر وقت تک یہ پتہ نہ چلا کہ میں کس مسیح کے مثیل ہونے کا دعویٰ کر رہا ہوں؟ آیئے مرزا صاحب کی معلومات کے اس پہلو کو بھی ذرا واضح کردیں۔

جن لوگوں نے تاریخِ یورپ اور اسلام اور مسیحیت کی تاریخ کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ موجودہ اناجیل یعنی عہد نامۂ جدید کا مسیح اور قرآن مجید کا مسیح دو مختلف اشخاص ہیں جن کو ایک دوسرے سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جس مسیح کا مذکور ہے وہ اللہ کے برگزیدہ رسول تھے اور ان کی بعثت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یہود کو رومیوں کی غلامی سے نجات دلائیں جیسا کہ شروع سے تمام انبیاء کا مقصد رہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ انہوں نے اپنی قوم کو درسِ حریت دیا۔

جس طرح تمام سلطنتوں کا قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو روا نہیں رکھ سکتیں کہ کوئی شخص محکوموں کو اس برگِ حشیش کا اُتار پلائے جو ازل سے شہنشاہیت کے دسترخوان سے رعایا کو مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔ رومی حکومت بھی اس بات کو برداشت نہیں کرسکتی تھی کہ جناب مسیح علیہ السلام قومِ یہود کو حریت کا سبق پڑھائیں، یا ان کے دل میں لیلائے آزادی سے ہمکنار ہونے کی تمنا پیدا کریں۔ پس حکومتِ وقت نے نہایت چابکدستی کے ساتھ علمائے یہود کو آلۂ کار بنایا اور ان کی مدد سے ''حکومت کے باغی'' کو کانٹوں کا تاج پہنا کر اپنی راہ سے ہٹا دیا۔

جب حکومت کو جنابِ مسیح کی طرف سے اطمینان ہوگیا تو اس نے دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ اصلی انجیل کو جو آرامی یا عبرانی زبان میں تھی اور جس میں یقیناً غیر اللہ کی غلامی سے نکلنے کی تاکید ہوگی، رفتہ رفتہ صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیے نابود کر دیا اور اس کی جگہ مختلف شہروں میں مختلف ''انجیلیں'' پیدا کردیں، جن کی تعلیماتِ مذہبی، حکومت کی منشاء کے مطابق تھیں۔ کلیسا کے مؤرخین نے اپنی کتابوں میں تقریباً ۱۵۰ انجیلوں کا ذکر کیا ہے جو یہود میں تشتت اور افتراق پیدا کرنے کے لیے حکومت کے ایماء سے مختلف اوقات میں مختلف لوگوں نے مرتب کیں۔ جب قسطنطین سریر آرائے (سلطنت ہوا تو اس کی) حکومت میں صلیب پرستوں کو عروج حاصل ہوا اور انہوں نے اپنی منشاء کے مطابق چار انجیلیں اور شاگردوں کے خطوط منتخب کر کے ''عہدِ جدید'' مرتب کردیا جو آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ جس کا قدیم ترین نسخہ یونانی زبان میں پانچویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس سے پہلے کا حال پردۂ خفا میں مستور ہے لیکن اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ جناب مسیح نے اگر کوئی کتاب اپنی قوم کو دی ہوگی تو وہ یونانی نہیں بلکہ عبرانی یا آرامی زبان میں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ مسیح کی انجیل کے اس رومن ایڈیشن میں آپ کو ایسی ایسی باتیں ملیں گے جو ہرگز ہرگز خدا کے کسی اوالوالعزم نبی کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ مثلاً قیصر کا حق قیصر کو دو، میری بادشاہت اس دنیا کی نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہود کو رومی قوم سے سخت نفرت تھی لیکن اس انجیل کے مطالعہ سے یہ بات قطعاً ظاہر نہیں ہوتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ رومی حکومت نے سچے مسیح اور سچی انجیل دونوں کو یہود کی نظروں سے اوجھل کر کے ایک خود ساختہ مسیح اور خود پرداختہ انجیل قوم کو دی۔ موجودہ انجیلوں کا مسیح تو ایک ''صوفی مسیحا'' نظر آتا ہے جو ترکِ دنیا پر اور تجرد اور غلامی پر قناعت پر زور دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں رومی حکومت کے لیے مفید تھیں۔ اب مرزا صاحب کو دیکھئے، آپ نے بھی برطانوی حکومت کی اطاعت کو جزوِ ایمان قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو برگِ حشیش پلانے کی سعی نا کام کی ہے۔ جس طرح موجودہ انجیل کا پیش کردہ مسیح رومی حکومت کا مطیع نظر آتا ہے اسی طرح موجودزمانہ کا ''مثیلِ مسیح'' برطانی حکومت کا مطیع نظر آتا ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مرزا صاحب مثیلِ مسیح تو ہیں مگر نقلی مسیح کے مثیل ہیں، جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور نہ احادیث میں۔

واضح ہو کہ مرزا صاحب نے ایک مرتبہ ضلع گورداس پور کے ایسے افراد کی فہرست مرتب کی تھی جو اُن کی نظر میں ''وفادار'' نہ تھے اور حکومت کو ان کے متعلق معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ مرزائیوں نے اکثر اوقات اپنے مرشد کی اس تعلیم پر عمل کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی ممالک میں احمدیت کے ان مبلغین کو ''برطانوی جاسوس'' سمجھا جاتا ہے۔ غالباً اسی اصولِ جاسوسی کے ماتحت مدیر سن رائز نے بھی حکومت کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال مسلمانوں کو درسِ حریت دے رہے ہیں اور ممکن ہے کہ ان کے پیغام کو پڑھ کر مسلمانانِ ہند اُن کے ہم خیال ہو جائیں۔

مدیر مذکور کو معلوم ہونا چاہیے کہ علامہ موصوف خدا کے فضل و کرم سے، مرزائیوں کے اس فعل کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتے۔ انھیں اس کی مطلق پروا نہیں اگر حکومت کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ مسلمانوں کو بیدار کر رہے ہیں۔ یقیناً مسلمانوں کو بیدار کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ شاید مرزائیوں کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ مسلمانوں کو بیدار کرنا ہی علامہ موصوف کی زندگی کا واحد مقصد ہے۔ ''ولو کرہ الکافرون۔''

بیشک علامہ موصوف، اسلامی ممالک پر دولِ مغرب کے تسلط و اقتدار کو ناپسند کرتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی مسلمان جس کے دل میں اسلام کی محبت ہے ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا کہ اسلامی ممالک، استعمار پرستانِ مغرب کی ہوس پرستی کا شکار ہو جائیں۔ ابھی چند روز کی بات ہے کہ بہت سے مسلمان ارکانِ اسمبلی کے وفد نے جو وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوا تھا صاف لفظوں میں حکومت کو بتا دیا کہ مسلمانانِ ہند حکومت برطانیہ کی اس حکمتِ عملی کو جو فلسطین کے متعلق کارفرما ہے، سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ خود حکومت برطانیہ بھی اس حقیقت سے آگاہ ہو چکی ہے کہ مسلمانانِ عالم اس استعماری پالیسی سے سخت بیزار ہو چکے ہیں۔ چنانچہ انگلستان کے بعض مدبرین اور امرائے سلطنت جن کے ناموں سے دنیا واقف ہے مسلمانوں سے دوستی پیدا کرنے کے لیے ایک انجمن بھی قائم کر چکے ہیں۔ اور حکومت کو بہت سے سیاسی مبصر اکثر متنبہ کرتے رہے ہیں کہ اسے مسلمانوں کے جذبات کے خلاف کوئی قدم نہیں اُٹھانا چاہیے۔ لہٰذا مدیر ''سن رائز'' کو مطمئن رہنا چاہیے کہ علامہ موصوف یا مسلمانانِ ہند پر ان کی گیدڑ بھبکیوں کا مطلق کوئی اثر مرتب نہ ہوگا۔

تبصرہ نگار نے اس ریویو میں یہ بھی لکھا ہے کہ اقبال کے کلام میں شعریت نہیں ہے۔ ہمیں یہ الفاظ پڑھ کر مطلق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعجب نہیں ہوا کیونکہ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست والا مضمون ہے۔ جو لوگ مرزا صاحب کو سلطان القلم کہتے ہیں اور ''درثمین'' کے اشعار کو مزے لے لے کر پڑھتے ہیں، وہ بالِ جبریل یا ضربِ کلیم کے اشعار کی قدر و منزلت کس طرح کر سکتے ہیں۔

مدیر مذکور کا یہ کہنا کہ ڈاکٹر صاحب کے کلام میں تلخی پائی جاتی ہے۔ سو اس کے متعلق گزارش ہے کہ تلخی اور تلخ کامی جو ناکامی کا نتیجہ ہے، وہ تو کچھ قادیان ہی کے حصے میں آئی ہے۔ پرانی باتوں کو جانے دیجیے۔ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح اور سیدنا حضرت امیر قوم کے خطبات وارشادات ہی کو دیکھ لیجیے جو ہر ہفتے (روزنامہ) الفضل اور (ہفت روزہ) پیغام صلح میں شائع ہوتے ہیں اور جن میں ایک دوسرے کے خلاف کیا کیا زہر اگلا جاتا ہے۔ کیا مدیر ''سن رائز'' چاہتے ہیں کہ ہم انھیں ''اوبد ذات فرقۂ مولویان'' اور ''ذریت البغایا'' جیسی نادر ترکیبیں از سرِ نو یاد دلائیں؟

اس بات کا تو دشمنوں کو بھی اعتراف ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے کلام میں بشارت ہے، اُمید ہے، جوش ہے، پاکیزگی ہے، مسرت ہے، مختصر یہ کہ نویدِ حیات ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اگر احمدیت کو بے نقاب کیا ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ اسے اسلام کی سیاسی طاقت کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں بلکہ وہ اسے اسلام کی وحدت کے لیے ضرور مضرت رساں خیال فرماتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مرزا صاحب نے بھولے بھالے مسلمانوں کو اسلام کے لباس میں جلوہ گر ہو کر راہِ راست سے ورغلایا۔ انہوں نے یہ کہہ کر ناواقف مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کی کہ میں کسرِ صلیب کے لیے مبعوث ہوں حالانکہ وہ خود مدۃ العمر صلیب پرستوں سے دادِ وفاداری طلب کرتے رہے اور اس مطلب کے چند الہام بھی شائع کیے۔ مگر افسوس کہ کچھ قدر دانی نہ ہوئی۔ صلیب کی مخالفت مگر صلیبی قوتوں کی حمایت کیسا عجیب فلسفہ ہے۔ گلگلے کھانا مگر تیل سے پرہیز کرنا غالباً ایسے ہی موقعوں کے لیے کہا گیا ہو گا۔ اگر انہیں یورپین تاریخ سے واقفیت ہوتی تو شاید اس قسم کا دعویٰ کرنے کی زحمت گوارا نہ فرماتے کیونکہ ظاہری اور معنوی دونوں پہلوؤں سے یہ کام خود یورپ ہی نے مرزا صاحب کی پیدائش سے پہلے سرانجام دے دیا تھا۔

معنوی رنگ میں کسر کا دور اٹھارویں صدی میں شروع ہوا جب خود عقلائے یورپ نے ریفارمیشن کے بعد مسیحیت کے خلافِ عقل اور مشرکانہ عقائد کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔ تثلیث، تجسیم، کفارہ، ہبوطِ آدم، سرنوشت ازلی، معصومیتِ پوپ، استحالہ جوہری، عشائے ربانی، الوہیتِ مسیحی اور الہامِ انجیل سب کے پرخچے اڑا دیے اور انیسویں صدی میں تو اسٹراؤس نے یسوع کی شخصیت ہی کو (Myth) ثابت کر دیا اور Baur نے تنقید بائبل کے اصول مدون کر کے اس ''الہامی مجموعہ'' کو بالکل پایۂ اعتبار سے ساقط کر دیا۔ آج یورپ اور امریکہ میں فی صدی ایک تعلیم یافتہ انسان بھی ان عقائد پر ایمان نہیں رکھتا اور خود کلیسائی عہدہ داروں کو اس تلخ حقیقت کا اعتراف ہے۔ ظاہری رنگ میں کسرِ صلیب کا نظارہ خود بیسویں صدی میں ہماری آنکھوں نے دیکھ لیا جبکہ بالشویکوں نے مسیحیت کو بہ یک بینی و دو گوش اور اس کے ساتھ ہی مذہب کو بھی اپنے ملک سے خارج کر دیا۔

کردہ　ام　اندر　مقاماتش　نگہ
لا　سلاطیں　لا　کلیسا　لا　الٰہ (۱۳)

الغرض کسرِ صلیب تو جس حد تک کی، یورپ نے کی۔ ہمارے مرزا صاحب نے کیا کیا؟ ہماری دانست میں انہوں نے اگر کچھ کیا تو یہ کہ مسلمانوں کو جنابِ مسیح کی قبر کا پتہ بتا دیا۔ حالانکہ وہ قبر جنابِ مسیح کی نہیں بلکہ بوزآسف کی ہے جو بدھ مذہب کا ایک سرگرم مبلغ تھا۔ مرزا صاحب نے بوز کو بیک جنبشِ قلم ''یوز'' بنا دیا اور ''یوز'' کا سلسلہ یسوع سے ملا دیا۔ (۱۴)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم پر غلامی مسلط ہو جاتی ہے تو اس کے افراد کی زندگی کے ہر شعبہ میں کاہلی، تن آسانی اور بزدلی پیدا ہو جاتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم زندگی کی کشمکش میں حصہ لینے اور اس کی مشکلات کا مقابلہ کرنے سے گریز کرتی ہے چنانچہ آپ مسلمانوں کے گزشتہ تین چار سو سالوں کے آرٹ، لٹریچر، مذہب اور تصوف کا مطالعہ کر لیجیے، یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکار ہو جائے گا۔

ہندی مسلمانوں کو شاعری وہ پسند آتی ہے جس میں خلافِ عقل باتیں بیان کی گئی ہوں، جن کو حقیقت اور واقعیت سے کوئی سروکار نہ ہو۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اپنی شاعری میں حقائق کائنات بیان کرتا ہے یا انہیں حقائقِ زندگی کی طرف بلاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ شاعری تو نثر کی طرح روکھی پھیکی ہے، شاعری ہی نہیں ہے۔ تصوف اور مذہب کی وہ تاویل پسند آتی ہے جو ان کے لیے ترکِ دنیا اور تن آسانی کا جواز پیدا کر سکے اور مسیحِ موعود اور مہدی معہود کے ظہور کے انتظار میں زندگی بسر کرنے کا موقع دے سکے۔

تحریکِ احمدیت، اسلامیانِ ہند کی اس غیر اسلامی ذہنیت کی پیداوار اور اُن کے انحطاط پر ایک روشن شہادت ہے۔ یہ ان کے زوال کی جیتی جاگتی تصویر ہے جو آج ہمیں نظر آ رہی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس تحریک کا تمام تر خلاصہ اور مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے سے گریز کیا جائے اور اغیار کی غلامی کو موجبِ رحمت سمجھا جائے۔

اس خاص قسم کی نبوت کی غرض و غایت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کو برگِ حشیش کے جام پلائے جائیں اور ان کو ایسی خواب آور گولیاں، مذہب کے ورق میں لپیٹ لپیٹ کر کھائی جائیں کہ وہ اپنی ذلت اور نکبت، محکومی اور غلامی، پستی اور خواری کسی چیز کا احساس ہی نہ کر سکیں۔ اگر میرا یہ قول باور نہ ہو تو تحریکِ احمدیت کا مطالعہ کر کے دیکھ لیجیے۔ سوال یہ ہے کہ اس تحریک نے مسلمانوں کو اپنی حالت کے سنوارنے کا، اپنی سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی مشکلات دور کرنے کا اور دنیا میں عزت اور شرافت کی زندگی بسر کرنے کا کیا طریقہ سکھایا ہے؟

اگر آپ مرزا صاحب کی تعلیمات کے ساتھ علامہ اقبال کے کلام اور ان کے روح افروز پیغام کا مقابلہ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دنیائے اسلام کے اس عدیم المثال شاعر کے سامنے، سرزمین پنجاب کا یہ ''نبی'' ادعائے وحی و الہام اور پچاس الماری کتابوں اور لایعنی پیشگوئیوں کے باوجود، کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ ان دونوں میں موازنہ چہ معنی دارد، دور کی بھی نسبت نہیں ہے، ایک اپنی قوم کو آزادی اور سربلندی کا درس دے رہا ہے، دوسرا اسے غلامی اور رسوائی کے قعرِ مذلت کی طرف لے جا رہا ہے۔ (۱۵)

آج مسلمانوں کے لیے جو مسائل، موت و زیست کا حکم رکھتے ہیں وہ یہ نہیں کہ مسیح مر گئے یا زندہ ہیں، اور مرزا غلام احمد قادیانی مثیلِ مسیح ہیں یا نہیں بلکہ یہ کہ غلامی زنجیریں کیونکر کٹیں، اور استعمار پرستانِ مغرب کے چنگل سے رہائی کیونکر نصیب ہو۔ جو نبی اس غلامی کو رحمت قرار دیتا ہو، اس کی تعلیمات میں، مسلمانوں کی موجود مشکلات کا حل تلاش کرنا ایسا ہی ہے، جیسے ''چیل کے گھونسلے میں ماس'' تلاش کرنا۔

یہ پیشگوئی کہ تین سو سال کے بعد تمام دنیا احمدی ہو جائے گی مسلمانوں کے موجود مصائب کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔ پس میں تمام احمدیوں کو مخلصانہ طور پر نصیحت کرتا ہوں کہ اگر وہ اسلام کے دوست ہیں، جیسا کہ وہ بیان کرتے ہیں تو برائے خدا پنجاب کے بھولے بھالے مسلمانوں کی حالت پر رحم فرمائیں اور انہیں غلامی کا سبق پڑھانے سے باز آ جائیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمان بہت دنوں تک خوابِ غفلت میں سوتے رہے اور دشمنوں کو دوست سمجھتے رہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اقبال کے کلام میں حیاتِ تازہ کا سامان تلاش کریں۔ اقبال شاعر نہیں بلکہ مسیحا ہے۔ اس کا کلام مردہ دلوں کی زندگی بخشتا ہے اور اس کا پیغام فی الحقیقت اسلام ہی کا پیغام ہے۔ اسی لیے وہ کہتا ہے:

از تب و تابم نصیبِ خود بگیز
بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر(۱۶)

حواشی

۱۔ کلیاتِ اقبال صفحہ:۷۷۳
۲۔ کلیاتِ اقبال صفحہ:۶۴
۳۔ خواجہ کمال الدین جو (امیر جماعتِ احمدیہ لاہور، مولوی محمد علی لاہوری کے دستِ راست اور (مرزا قادیانی) کے نہایت معتمد اور وفادار مریدوں میں سے تھے، اپنی کتاب ینابیع المسیحیت کے ضمیمہ موسومہ اسلامی اصولِ جنگ میں رقم طراز ہیں: ''بعض اوقات ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ انسان کے لیے اپنے دین کی حمایت میں تلوار اٹھانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جنابِ مسیح کو اپنی قوم کی غلامی کا احساس تکلیف نہیں دیتا تھا؟ اور اگر انہیں موقع ملتا تو کیا وہ اپنی قوم کی بہبود کے لیے مدافعانہ جنگ کا اعلان نہ کرتے؟ اسی کو دوسرے لفظوں میں جہاد کہتے ہیں۔'' پس معلوم ہوا کہ مرزا صاحب کے ایک قابل اور تعلیم یافتہ مرید جنھوں نے برسوں اپنے مرشد کی صحبت میں رہ کر فیض حاصل کیا تھا، بھی اسلامی جہاد کو جائز سمجھتے تھے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے مذہب کی حمایت میں تلوار اٹھا سکتا ہے۔

ہماری رائے میں مناسب ہے کہ قادیانی اور لاہوری فریق پہلے آپس میں تبادلۂ خیال کر کے یہ فیصلہ کر لیں کہ خواجہ صاحب کا نظریہ مسلکِ احمدیہ کے مطابق ہے یا مخالف۔ (مصنف)

۴۔ کلیاتِ اقبال صفحہ:۱۱۰
۵۔ کلیاتِ اقبال صفحہ:۸۲۰
۶۔ بعد میں اقبال نے یہ مصرع یوں بدل دیا: تا کجا باشی بہ بندِ اہرمن، کلیات اقبال صفحہ:۸۳۳
۷۔ کلیاتِ اقبال صفحہ:۸۳۳
۸۔ کلیاتِ اقبال صفحہ:۸۴۲
۹۔ کلیاتِ اقبال صفحہ:۸۱۱
۱۰۔ کلیاتِ اقبال صفحہ:۵۱۸
۱۱۔ کلیاتِ اقبال صفحہ:۵۰۶
۱۲۔ لیکن اس قسم کی ایجاد کا سہرا بھی مرزا صاحب کے ایک پیشرو مختار کے سر پر ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے امام حسین رضی اللہ عنہ کے دشمنوں سے جنگ کی تھی اور اس طرح حامیانِ آلِ علی کی ہمدردی اسے حاصل ہو گئی تھی۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے ایک نئے فرقہ کی بنیاد ڈال دی جسے تاریخ میں کیسانیہ کا نام دیا گیا ہے۔ مختار نے مامور من اللہ اور ملہم ربانی ہونے کا دعویٰ کیا اور بہت سے سادہ لوح اس کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ آگے چل کر اس نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیشگوئیوں کا سلسلہ بھی شروع کیا جن میں سے اکثر پوری نہیں ہوئیں۔ اس پر اس کے بعض منچلے مریدوں نے اس سے سوال کیا کہ حضرت! یہ کیا بات ہے کہ آپ فلاں پیشگوئی، جس کے متعلق آپ نے نہایت وثوق کے ساتھ کہا تھا کہ ضرور پوری ہو گئی، پوری نہ ہوئی؟ مختار نے کہا میں دو دن کے بعد اس سوال کا جواب دوں گا۔ سوال مشکل تھا لیکن مختار کے جودت مآب دماغ نے عین وقت پر اس کی امداد کی اور جو جواب اس نے دیا وہ آج شیعہ علم کلام کا ایک اہم مسئلہ سمجھا جاتا ہے جسے بَدا کہتے ہیں۔ وہ یہ تھا کہ خدا پہلے ایک کام کا ارادہ کرتا ہے اور اس سے اپنے مقربینِ بارگاہ کو مطلع کر دیتا ہے لیکن پھر کسی وجہ سے ارادہ بدل دیتا ہے، اس لیے وہ بات پوری نہیں ہوتی اور محدود الفہم انسانوں کو دھوکہ لگ جاتا ہے۔ (مصنف)

۱۳۔ کلیاتِ اقبال صفحہ: ۸۱۵

۱۴۔ اب رہا مرزا صاحب کا یہ فرمانا:

چوں مرا نُورے پئے قوم مسیحی دادہ اند
مصلحت را ابنِ مریم نام من بنہادہ اند

یعنی آپ نے اپنے نزول کا دوسرا مقصد یہ قرار دیا ہے کہ آپ کی تعلیم سے مسیحی لوگ اسلام کی طرف مائل ہوں گے اور ہندوستان میں ''یدخلون فی دین اللہ'' کا نظارہ دوبارہ دیکھنے میں آئے گا۔ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ عیسائیوں کی تعداد میں کمی ہونے کے بجائے رات دن اضافہ ہی ہو رہا ہے، دور جانے کی ضرورت نہیں، مرزا صاحب کے ضلع گورداس پور میں، گزشتہ ۴۵ سال میں عیسائیوں کی مردم شماری میں جو اضافہ ہوا ہے، ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ چونکہ انہوں نے ۱۸۹۱ء میں ماموراور مجدد ہونے کا دعویٰ کیا تھا اس لیے اسی سنہ سے شروع کرتے ہیں:

۱۸۹۱ء میں عیسائیوں کی تعداد ۲۴۰۰ تھی۔
۱۹۰۱ء میں آپ نے نبی ہونے کا اعلان کیا اور ''ایک غلطی کا ازالہ'' شائع فرمایا تو ان کی تعداد ۴۷۱ ۴ ہوگئی۔
۱۹۱۱ء میں آپ کی نبوت کے بعد ان کی تعداد ایک دم ۱۳۳۶۵ ہوگئی۔
۱۹۲۱ء میں غالباً فیضانِ نبوت کی بدولت ۳۲۸۳۲ اور ۱۹۳۱ء میں ۴۳۲۴۵ ہوگئی (مصنف)

۱۵۔ اس جگہ اس امر کی صراحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ علامہ موصوف نے مخاطبہ و مکالمہ الٰہیہ کا کبھی دعویٰ نہیں کیا اور نہ انہوں نے یہ کہا کہ مجھے الہام ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کرتے ہیں اور ان کی تصانیف کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہوگی کہ وہ کس قدر صداقت، صفائی، خلوص اور دیانت داری کے ساتھ اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کرتے ہیں اور جس چیز کو وہ حق سمجھتے ہیں اسے لگی لپٹی رکھے بغیر علانیہ صاف صاف لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں۔ (مصنف)

۱۶۔ کلیاتِ اقبال صفحہ: ۸۲۱

جاری ہے

☆......☆......☆

© rasailojaraid.com